مولانا ابوالکلام آزاد کی عظمت

ڈاکٹر عبدالمغنی

مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق تین کتابوں پر تحقیقات اسلامی (جولائی ستمبر ۹۰ء) میں پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کا قدرے مفصل تبصرہ شائع ہوا۔ پھر جنوری، مارچ ۱۹۹۱ء کے تحقیقات میں ڈاکٹر سید عبدالباری کے طویل مقالہ کی اشاعت عمل میں آئی۔ پروفیسر عبدالمغنی نے ایک دوسرے رخ سے مولانا کی سوانح حیات کا مطالعہ کیا ہے۔ اسے بھی ایک نقطۂ نظر کی حیثیت سے ذیل کے صفحات میں دیا جارہا ہے۔ (جلال الدین)

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ایک تعزیتی پیغام میں اظہار خیال کیا کہ مولانا آزاد ایک اعلیٰ ظرف کے انسان تھے، جب کہ اپنی کتاب "تجدید و احیائے دین" میں مولانا مودودی لکھ چکے تھے کہ مسلمانوں کے لیے اسلامی نقطۂ نظر سے بیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ مولانا آزاد کا انقلاب حال ہے۔ مولانا مودودی کے ان دونوں اگلے پچھلے تبصروں کا تجزیہ و تقابل کرنے سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایک طرف مولانا مودودی مولانا آزاد کے سیاسی موقف سے اختلاف رکھتے تھے، اس لیے کہ ان کے خیال میں مولانا آزاد نے حکومت الٰہیہ یا اقامت دین کے نصب العین سے الگ ہو کر قومی ریاست و سیاست کا نقطۂ نظر اختیار کرلیا تھا، لیکن دوسری طرف ایک انسان اور عالم دین کی حیثیت سے مولانا مودودی کی نگاہ میں مولانا آزاد کی قدر اتنی زیادہ تھی کہ انھوں نے ہر حال میں مولانا آزاد کو ایک اعلیٰ ظرف کا انسان تسلیم کیا اور مولانا آزاد کے اندازِ نظر یا طریق کار میں تبدیلی کو مسلمانوں اور اسلام کے لیے ایک المیہ قرار دیا۔

اب دیکھنا چاہیے کہ بیسویں صدی میں عالم اسلام کی دو عظیم ترین شخصیتوں کے درمیان جو اختلاف رائے نظر آتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس سوال کا صحیح

جواب حاصل کرنے کے لیے ہندوستان میں مسلمانوں کے استقلال کے لیے دونوں بزرگوں کے نقاط نظر پر غور کرنا مفید ہوگا۔ اس سلسلے میں مولانا مودودی کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش" میں ہندوستان کی آزادی کے لیے مولانا کے پیش کیے ہوئے نقشے کا موازنہ اس خاکے کے ساتھ کیا جانا چاہیئے جو اس مقصد کے لیے مولانا آزاد نے یادداشت کے طور پر "انڈیا ونس فریڈم" میں درج کیا ہے۔ دونوں کتابوں کی تجاویز کا ماحصل ایک ہے، وہ یہ کہ آزادی کے بعد خودمختار ریاستوں کا ایک وفاق تشکیل دیا جائے تاکہ مسلم اکثریتی علاقوں کو استقلال کے ساتھ اپنے عزائم کے مطابق کام کرنے کا موقع ملے اور اس سے مجموعی طور پر پورے برصغیر میں مسلمانوں کے ملّی تشخص کا تحفظ ہو۔ یہی تجویز ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے بھی مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں پیش کی تھی۔

لہٰذا مولانا آزاد اور مولانا مودودی نیز علامہ اقبال، اقامتِ دین اور استقلال ملت کے تینوں علم برداروں کے خیالات اصلاً واصولاً ایک سیاسی نقطے پر ملتے جلتے تھے، فرق صرف یہ تھا کہ مولانا آزاد نے ریاستوں کے وفاق کو ہی ملک کے فرقہ وارانہ مسئلے کا آخری حل تصور کیا اور آخر تک اس پر اصرار کرتے رہے، جب کہ اقبال نے بعد میں قوم پرستوں کی روش سے مایوس ہوکر مسٹر جناح کے نام اپنے خطوط میں تقسیم ہند اور پاکستان کے قیام پر زور دیا اور مولانا مودودی نے بھی مسلم لیگ کی قرارداد مقاصد کی ترتیب میں تعاون کیا۔ دوسرا فرق مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے درمیان یہ ہے کہ آزادی کے بعد مولانا آزاد نے مرکزی وزارت میں شامل ہوکر ملک کی حکومت چلانے میں قوم پرست کانگریس کی مدد کی، جبکہ مولانا مودودی پاکستان میں اسلامی نظام کی تحریک چلاتے اور اس کی راہ میں فطری طور پر مسلم قوم پرستوں اور ان کی حکومتوں سے ٹکراتے رہے۔

سوال یہ ہے کہ مولانا آزاد اور مولانا مودودی نے اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے وقت میں، ملتِ اسلامیہ کے فروغ کے لیے جو کچھ کیا وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے؟ ۱۹۴۱ء میں جب مولانا مودودی نے جماعت اسلامی قائم کی، مولانا آزاد ایک قومی رہنما کی حیثیت سے ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اس لیے کہ ۱۹۲۰ء کے بعد انھوں نے حکومت الٰہیہ کے قیام کے

سلسلے میں گویا حالات سے مایوس ہو کر یا بہتر حالات پیدا کرنے کے لیے بڑے زور شور سے قومی سیاسی تحریک میں شرکت کر لی تھی، جب کہ اس وقت یہ تحریک درحقیقت خلافت کی ملی و بین الملی تحریک کا ایک حصہ تھی۔ مولانا آزاد نے یہ سمجھا کہ ملی استقلال کے لیے پہلی شرط ہندوستان کی آزادی ہے اور اس کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک برطانوی سامراج کے خلاف غیر مسلم اہل وطن کے ساتھ مل کر آئینی جنگ نہ کی جائے۔ جس زمانے میں مولانا آزاد نے یہ فیصلہ کیا تقریباً ایسا ہی خیال ہندوستان کے تمام علماء، مفکرین اور قایدین کا تھا، خواہ وہ اقبال ہوں، یا محمد علی جناح، یا اہل دیوبند و ندوہ۔ اس وقت مولانا محمد علی جوہر بھی ہندو مسلم اتحاد اور قومی جد وجہد کے ایک نمایاں علم بردار تھے۔ اس کے بعد حالات بدلتے رہے، خیالات بدلتے رہے، یہاں تک کہ مسٹر جناح کانگریس سے الگ ہو گئے۔ سیاست سے الگ رہے، پھر مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے بالآخر ایک علاحدہ پاکستان کا مطالبہ کیا۔ لیکن مولانا آزاد کی "انڈیا ونس فریڈم" کے علاوہ عائشہ جلال کی "جناح، دی سول والیس" اور سب سے بڑھ کر ایچ، ایم سیرا وائی کی "پارٹیشن آف انڈیا" نے دستاویزی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ملک کی تقسیم درحقیقت غیر مسلم قوم پرستوں کی نادانی اور برطانوی سامراج کی شرارت سے ہوئی۔ جب کہ مسٹر جناح خود مختار ریاستوں کے وفاق پر راضی ہو سکتے تھے۔

اس تناظر میں یہ بلاشبہ مولانا آزاد کی بصیرت و عزیمت کی دلیل ہے کہ اول تو وہ کانگریس کے اندر رہ کر اس کی قیادت کی بلند ترین سطح سے بھی آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے استقلال کے لیے صحیح بات آخر تک پورے زور شور سے کہتے رہے اور اس سلسلے میں انہوں نے گاندھی، نہرو، پٹیل سب سے مقابلہ کیا، پھر تقسیم ہند کے بعد، جب کروڑوں مسلمان اور ان کے سب ادارے زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھے، خدا کے بعد یہ صرف مولانا آزاد کی تنہا ذات تھی جس نے مسلمانوں کو سہارا دیا، ان کے اداروں کو بچایا اور ان کے بکھرتے ہوئے شیرازے کو باندھنے کی کوشش کی۔ اس کار عظیم میں مولانا نے نہ تو کسی قوم پرست کی مزاحمت گوارا کی، نہ کسی فرقہ پرست کی، کسی کی ملامت اور مخالفت کی پروا کیے بغیر انہوں نے حق کا اعلان اور اقدام دونوں پوری دلیری اور دیدہ وری کے ساتھ کیا۔ ہندوستان کا وہ آئین جو تمام فرقوں کو ہر قسم کی آزادی اور برابری کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اس کی تشکیل میں مولانا آزاد کے تدبر کا حصہ بہت زیادہ ہے، اس کے علاوہ تشکیلی

دَور میں آزاد ہندوستان کی داخلہ و خارجہ پالیسیوں کی ترتیب میں بھی بلاشبہ مولانا آزاد کی فراست کو دخل ہے۔ ملک کے باہر مسلم ممالک کے ساتھ ہندوستان کے دوستانہ تعلقات سے لے کر ملک کے اندر مشہور ملّی تعلیمی و علمی اداروں کے تحفظ و ترقی تک مولانا آزاد کی بصیرت و جرأت مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے ہر معاملے میں نمایاں طور پر کارفرما رہی۔ انہوں نے اس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک کے تحفظ کا سامان کیا جس سے ان کو ایک زمانے میں نظریاتی اختلاف رہا تھا اور جس کے نادان طلبہ نے کبھی ان کے ساتھ انتہائی بدتمیزی کی تھی۔

غلام و آزاد ہندوستان کی ملّی و قومی دونوں سرگرمیوں میں مولانا آزاد کی پیش قدمیاں ان کی عظمت کی ناقابل تردید دلیلیں اور ناقابل فراموش یادگاریں ہیں۔ پچھلے نوّے سال کے ہندوستان کی تاریخ کے پیچ و خم پر ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور کرنے سے صاف محسوس ہوگا کہ مولانا آزاد نے عصر حاضر میں ملک و ملت، دین و دنیا دونوں کے لیے جو علمی و عملی کارنامے انجام دیے قدرت خداوندی نے ان کو انہیں کے لیے پیدا کیا تھا۔ منقسم ہندوستان میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد ملت اسلامیہ کے ترکش کے آخری تیر تھے۔ اکیسویں صدی میں کسی وقت جب بیسویں صدی کے حالات کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا تو ہر دیانت دار اور ہوش مند شخص کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ گذشتہ صدی میں اسلام اور مسلمانوں کے فروغ میں مولانا آزاد نے جو خدمات انجام دیں وہ دوسرے کسی مسلمان سے کم نہیں تھیں، خواہ وہ اقبال ہوں، یا جناح، یا محمد علی، یا مودودی، یا ان سے پہلے سرسید و شبلی۔ یہ سب تاریخ کی عظیم شخصیتیں تھیں اور ان کے درمیان جو کچھ اختلاف رائے نظر آتا ہے وہ ان کے خلوص پر مبنی تھا اور ان کے طریق کار میں جو فرق ظاہر ہوا وہ ان کی صواب دید کے مطابق تھا۔ اہل فکر و نظر کے درمیان فرق و اختلاف کوئی نئی بات نہیں، یہ بالکل فطری، معقول اور معمول کے مطابق ہے۔ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ کس صاحب فکر و نظر کے اپنے کمالات اور کارنامے کیا ہیں۔ اس اعتبار سے جن شخصیتوں کے نام اوپر لیے گئے وہ سب کی سب قابل قدر ہیں اور تعظیم و احترام کی مستحق۔ ان کے بعد آنے والوں کو ان سب سے استفادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے، لیکن اس کے لیے کھلے ذہن سے مطالعہ اور حقائق کی جستجو شرط ہے، ورنہ محض ذاتی تعصبات سے کام لے کر کسی صاحب علم اور صاحب عمل کے مونھ آنا اور کیچڑ اچھالنا کم نظری، کم علمی، کم عقلی اور

کم ظرفی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد محض سیاست داں نہیں تھے، ایک عہد آفریں عالم اور ادیب بھی تھے۔ ایک عالم کی حیثیت سے ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" ہے، جو یقیناً مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن" کے ساتھ ساتھ نہ صرف اردو بلکہ کسی بھی زبان میں کلام اللہ کی ایک بہترین ترجمانی ہے، اگرچہ مولانا آزاد اپنی تفسیر مکمل نہیں کرسکے، مگر جس حد تک انہوں نے کام کردیا وہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ ان کا مطالعہ دین کتنا وسیع اور گہرا تھا۔ اپنی اس تفسیر قرآن میں انہوں نے کوئی بات جمہور امت کے عقیدے کے خلاف نہیں کہی ہے، اگرچہ مختلف امور میں انہوں نے دیگر مفسرین سے مختلف تعبیریں کلام اللہ کی پیش کی ہیں اور اس کا ان کو حق تھا، اس لیے کہ وہ اپنے علمی رسوخ کی بنا پر کسی دوسرے بڑے سے بڑے، عالم دین کے مقلد نہیں ہوسکتے تھے، مولانا مودودی ہی کی طرح وہ بھی ایک مجتہد عصر تھے۔ مولانا آزاد کی نگاہ قرآن، حدیث اور فقہ کے تمام دینی علوم پر یکساں وسیع تھی، جس کا ثبوت ان کے تفسیری مباحث میں قدم قدم پر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دنیوی علوم بالخصوص جدید علوم کا ادراک بھی انہیں اسی طرح تھا جس طرح مولانا مودودی کو۔ تفسیر قرآن کے معاملے میں عربی زبان وادب سے مولانا آزاد کی براہ راست اور ماہرانہ واقفیت بھی ان کے کمال تفسیر کا ایک سبب ہے۔

بعض لوگوں نے "ترجمان القرآن" کی اشاعت کے بعد مولانا آزاد کے چند تفسیری بیانات پر کچھ اعتراضات کیے، لیکن مولانا نے اسی وقت ان اعتراضات کے کافی وشافی جوابات دے دیئے تھے۔ اس کے باوجود اگر کچھ لوگ ابھی تک اعتراضات کی لکیر پیٹ رہے ہیں تو ان کی بند آنکھیں کھولنے کے لیے میں اپنی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد ذہن و کردار" (مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی ۱۹۸۹ء) سے حسب ذیل دستاویزی اقتباسات نقل کرتا ہوں:

> "آپ نے تفسیر فاتحہ کے خلاصے کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے اس وقت از سر نو اس پر نظر ڈالی، لیکن کوئی بات ایسی نظر نہ آئی جو اس اشتباہ کا موجب ہوسکے غالباً اس کا یہ جملہ موجب تردد ہوا ہے کہ اصل دین

توحید ہے۔ لیکن اگر یہ جملہ موجب تردد ہو سکتا ہے تو یقیناً قرآن کی بے شمار آیتیں بھی ہو سکتی ہیں اور عقائد و کلام کی وہ تمام کتابیں جو تیرہ سو برس کے اندر لکھی گئی ہیں، کیوں کہ ان سب میں یہی بات کہی گئی ہے۔۔۔۔ کیا ہم ان آیات اور ان کی ہم معنی آیات سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ قرآن کے نزدیک ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ یقیناً نہیں کر سکتے، کیوں کہ اس قرآن نے بے شمار مقامات پر یہ بھی بتلا دیا ہے کہ ایمان باللہ کی تفصیل کیا ہے اور نہ صرف ایمان بالرسل بلکہ ایمان بالکتب و بالملائکہ و بالیوم الآخر اس میں داخل ہے، اور اس لیے جب کبھی "ایمان" اور "عمل" کہا جائے گا تو ایمان سے مقصود یہی ایمان ہو گا نہ کہ کوئی دوسرا ایمان اور عمل سے مقصود وہی اعمال ہوں گے جنہیں اس نے عمل صالح قرار دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ عدم تفویق بین الرسل بھی اس میں داخل ہے اور کوئی ایمان بالرسل جو تفویق بین الرسل کے ساتھ ہو قرآن کے نزدیک ایمان نہیں۔۔۔۔ آئندہ کے لیے اس (قرآن) کا اعلان معلوم ہے کہ نعمت تمام ہو چکی اور یہ اتمام نہ صرف اصل دین میں ہے بلکہ شرع و منہاج میں بھی، اور اتمام کے بعد مزید تبدّل ممکن نہیں۔ اکمال کے بعد مزید تکمیل کی گنجائش نہیں۔

یہ ہمارے ذمہ ہے کہ ہم ہر طالب حق پر واضح کر دیں کہ جس طرح اصل دین کی دعوت کامل ہو چکی، اور وہ پچھلی تمام دعوتوں کا جامع و مشترک خلاصہ ہے، ٹھیک اسی طرح شرع و منہاج کا معاملہ بھی کامل ہو چکا اور وہ تمام پچھلی شرائع کے مقاصد و عناصر پر جامع و حاوی ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ اس بحث کا محل سورۂ فاتحہ یا سورۂ بقرہ نہیں ہے، سورۂ احزاب ہے"۔ (مکتوب بنام غلام رسول مہر، منقول از "میرا عقیدہ" مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۵۹ء، صفحات ۱۹–۱۲)

"کیا آپ مجھے تحریر کریں گے کہ ترجمان القرآن میں کہاں یہ لکھا ہے کہ قرآن کے نزدیک نجات کے لیے ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ کم سے

کم سورۂ بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، انعام میں پچاس ساٹھ جگہ ایمان بالرسل کا حکم آیا ہوگا۔ کیا آپ کو کوئی مقام ایسا ملا ہے جہاں اس کی یہ تشریح کی گئی ہو کہ ایمان بالرسل ضروری نہیں؟ اتنا ہی نہیں بلکہ تفسیر سورہ فاتحہ میں تو خصوصیت کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی ہے کہ قرآن کے نزدیک تفریق بین الرسل کفر ہے، یعنی سلسلۂ نبوت کی کسی ایک کڑی کا انکار بھی سب کا انکار ہے اور دروازۂ نجات بند کر دیتا ہے۔ اگر ایمان بالرسل ضروری نہیں تو تفریق بین الرسل کیوں کفر ہو؟

(ص ۲۳ میرا عقیدہ۔ مکتوب بنام حکیم سعد اللہ)

"میں سمجھتا ہوں کہ اس تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ یہی رہا ہے کہ دین ناقص نہیں اور اپنی تکمیل کے لیے کسی نئے ظہور (مہدی و مسیح و ظلی و بروزی نبی) کا محتاج نہیں۔۔۔۔ یہ سوال آپ اس شخص سے کر رہے ہیں جو اپنی تحریرات میں نہ صرف حدیث کو حجت اور واجب العمل ثابت کر چکا ہے بلکہ جس کو اس فہم کی توفیق ملی ہے کہ "ویعلمہم الکتاب والحکمۃ" میں "حکمت" سے مقصود "سنت" ہے۔۔۔۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جس کی تمام قلمی وجد وجہد یکسر دعوت اتباع کتاب وسنت پر مبنی رہی اور جس کے عقیدہ میں کتاب کا ہر اتباع اتباع نہیں جو سنت کے اتباع سے خالی ہو"

(ص ۳۶ میرا عقیدہ، مکتوب بنام مولانا ثناء اللہ امرتسری)

ان اقتباسات کے بعد مزید کسی وضاحت وتشریح کی کوئی ضرورت نہیں تفسیر قرآن ظاہر ہے کہ آیات کی تفسیر ان کے سیاق وسباق میں ہے جبکہ عقائد کے بیان کے لیے یا تو فقہ کی کتابیں ہیں یا پھر خود وہ آیات جن میں عقائد بتائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کا اپنا عقیدہ ہم انہی کے لفظوں میں دیکھ چکے ہیں۔ اب ان پر کوئی اعتراض یا تو بد دیانتی ہے یا کم علمی یا دونوں ہی۔

مولانا آزاد کے علم دین کی وسعت کے شاہد وہ بے شمار مضامین ومقالات ہیں جو الہلال والبلاغ وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے اور ان کے متعدد مجموعے موجود ہیں۔ مولانا کا ادبی کمال ان کے طرز تحریر میں ہے، جس کے تین مختلف ادوار ہیں، ایک لسان الصدق

کا دور، جو بالکل سہل و سادہ ہے اور سرسید سے متاثر، دوسرا الہلال والبلاغ کا دور، جو تذکرہ تک جاری رہتا ہے، عربی و فارسی اور شعروشاعری کے وزن سے گراں بار بھی ہے، پرلطف بھی، فکرانگیز بھی، تیسرا ترجمان القرآن اور غبار خاطر کا دور، جس میں اردو نثر فصاحت و بلاغت کے درجۂ کمال تک پہنچ گئی ہے۔ آخر کے دونوں ادوار پر کسی نہ کسی جہت سے شبلی کا اثر ہے، مگر درحقیقت یہ ایک صاحب طرز ادیب کے اسلوب نگارش کے ارتقائی اپنی منزلیں ہیں جن کے ساتھ ساتھ اردو نثر کا ارتقا بھی ہوتا گیا ہے۔ ترجمان القرآن کی نثر اس طرح اردو زبان کی بہترین نثر ہے جس طرح تفہیم القرآن میں مولانا مودودی کی نثر۔ فی الواقع ترجمان و تفہیم کے اسالیب کو اردو نثر کا نقطۂ عروج کہا جانا چاہئیے۔ اس سلسلے میں راقم السطور "مولانا مودودی کی ادبی خدمات" پر ایک مختصر کتاب لکھ چکا ہے اور "مولانا ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش" پر بھی جو زیر طبع ہے۔

"تذکرہ" کے ایک حصے اور "غبارِ خاطر" میں مولانا آزاد نے اپنی انا کا جو اظہار کیا ہے وہ ان کا ایک ذہنی رویہ اس حد تک نہیں جس حد تک ایک طرز نگارش ہے، جس کا پورا پورا حق آزاد جیسے ایک منفرد عالم و ادیب کو پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں انانیتی ادب پر مولانا نے جو اظہارِ خیال کیا ہے اس پر ایک نظر ڈال کر دیکھنا چاہئیے کہ اس موضوع پر ان کا زاویۂ نگاہ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے انانیت پرستوں سے الگ اپنی ایک ایسی راہ نکالی ہے جسے دوسرے لفظوں میں اقبال کی خودی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح البقوریت کی جو تعریف و تشریح مولانا نے کی ہے وہ مشہور مغربی ایپی کیورس سے جدا ایک خاص قسم کی صوفیانہ نفاست پسندی ہے۔ یہ سب گویا ادب و فلسفہ کی دنیا میں مولانا کے اجتہادات و کمالات ہیں۔ غبار خاطر کی انشاپردازی یا انشائیہ نگاری خطوط نگاری کی دنیا میں بھی ایک قسم کا انقلابی قدم ہے، جو غالب کی خطوط نگاری سے آگے کا ایک ادبی مرحلہ ہے۔ اس سلسلے میں مولانا کا اسلوب نگارش اردو ادب کے نثری اسالیب میں ایک وقیع اضافہ و ترقی ہے۔

مولانا آزاد کے خلاف تعصبات کا سرچشمہ سیاسی اختلافات ہیں۔ مولانا نے برصغیر میں اسلام کے احیاء و فروغ کے لیے ۱۹۲۰ء کے آس پاس فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مسلمانوں

کا ملّی استقلال ضروری ہے جس کی خاطر ملک کی آزادی شرط اوّل ہے۔ یہی خیال اپنے وقت میں علامہ شبلی اور پھر علامہ اقبال کا بھی تھا، جب کہ سرسید نے انیسویں صدی کے اواخر میں محسوس کیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ مخلص نہیں ہیں، حالاں کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد "اسباب بغاوت ہند" کی تصنیف تک سرسید ہی برطانوی ہند کے سب سے بڑے قومی رہنما، بلا امتیاز فرقہ وطبقہ تھے، لہٰذا انھوں نے انگریزوں کے ساتھ مفاہمت مسلمانوں کے لیے مفید تصور کی۔ بہرحال، بعد میں اقبال اور جناح دونوں اپنے تجربات کی روشنی میں قوم پرستی کی تحریک پر ہندوؤں کے غلبے اور ان کی تنگ نظری سے مایوس ہو گئے، نتیجتہً جناح نے مسلم قوم پرستی کا راستہ اختیار کیا اور اقبال کی بین الملیت ایک آفاقی نظریہ بن گئی، جب کہ شبلی اور اہل دیوبند نے تحریک آزادی میں برادران وطن کے ساتھ اشتراک وتعاون کو ترجیح دی۔ اس راہ پر مولانا ابوالکلام آزاد بھی گامزن ہوئے۔ مسلم عوام بھی ایک مدت تک ان کے ساتھ رہے اور ایک بڑے حلقے نے ان کو امام الہند تسلیم کیا، مگر ۱۹۳۵ء کے بعد کانگریس کی نادانی اور غلطی سے مسلمانوں کا سواد اعظم اس قومی جماعت سے برہم ہوگیا اور بالآخر مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے تحت اس برہمی کو ایسا رخ دیا کہ مسلم عوام کے درمیان ان علمائے دین کی ساکھ گر گئی جو اب تک کانگریس کے ساتھ تھے۔ چنانچہ مسٹر محمد علی جناح تو ملّت اسلامیہ کے ایک بڑے حلقے کے قایدِاعظم بن گئے اور امام الہند مولانا ابوالکلام، جو اب تک ملّت کی قیادت کرتے رہے تھے، یوسف بے کارواں ہو گئے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے مولانا آزاد کے خلاف اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا، یہاں تک کہ پاکستان بن جانے کے بعد اس اسلامی ملک کے کچھ علماء و ادبا، مولانا آزاد کے خلاف نہایت رکیک وخفیف حرکات کرنے لگے۔ ماہرالقادری صاحب نے بہت ہی غلط طریقے سے "تذکرہ" میں مولانا آزاد کے بعض بیانات پر لغو قسم کی تنقیدیں کیں اور حسن عسکری نے مولانا آزاد کے اسلوب تحریر کا بھونڈا مذاق اڑایا۔ حالاں کہ علمی طور پر مولانا آزاد کے مقابلے میں ماہرالقادری صاحب کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور نہ ان کا کردار مولانا کی سیرت سے زیادہ معتبر تھا۔ جب کہ عسکری جیسے لوگوں کو مولانا آزاد کے طرز تحریر سے ادبی لطافت ونفاست کے کئی سبق مل سکتے تھے۔

پاکستان کے بعض کم نظر لکھنے والوں نے غیر منقسم برصغیر میں مسلمانوں کی

ملی تحریک کے جائزے میں ظلم و ستم کی حد کر دی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے نظریۂ پاکستان کی تائید و حمایت کی وہی سراسر حق پر ہیں اور بس انہی کی ملی خدمات معتبر ہیں، جبکہ تقسیم ہند کی مخالفت کرنے والے بالکل باطل پرست اور ناقابل اعتبار ہیں۔ اسی سیاسی تعصب اور نفسیاتی الجھن کا نتیجہ ہے کہ منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی سرگرمیوں کو پاکستان کے کچھ لکھنے والے کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ گویا ذوالفقار علی بھٹو کے اس بیہودہ بیان پر عمل کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی نماز جنازہ غائبانہ پڑھ لی ہے حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں چالیس سال سے کرب و بلا کے معرکوں سے گذرتے ہوئے مسلمانوں نے مجموعی طور پر جس دین پسندی اور ملت دوستی کا ثبوت دیا ہے وہ پاکستانیوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہو سکتی ہے۔ اہل پاکستان ۴۴ سالہ اقتدار کے باوجود اسلامی نظام کا نفاذ نہیں کر سکے اور ہندوستان کے مسلمان ابھی تک کم از کم اپنے اسلامی پرسنل لا کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ اس صورت حال میں جب پاکستان کے کچھ اہل قلم مولانا ابوالکلام آزاد پر طنز و تعریض کرتے ہیں تو اس سے ان کی کم علمی اور کم ظرفی ظاہر ہوتی ہے۔ ۳۵ء سے ۴۷ء تک مولانا ابوالکلام آزاد کو غیر منقسم برصغیر کے ایک حلقے نے مسلمانوں کی امامت کے منصب سے معزول کر دیا ہو تو اس زمانے کی سیاسی کش مکش کے مدِ نظر عجیب نہیں، مگر ۴۷ء سے ۵۸ء تک آزاد ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کے سوا مسلمانوں کا کوئی قاید نہیں تھا اور آج ملک میں مسلمانوں کے ملی وجود کی جو کچھ بھی شناخت ہے وہ سب سے زیادہ مولانا آزاد کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد بھی مسلمانوں کا کوئی دوسرا قاید ہنوز ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا، حالاں کہ مسلمان وزیر بھی ہوئے، وزیر اعلیٰ بھی، صدر جمہوریہ بھی۔

اب تک مولانا آزاد کی سیرت کے جو مطالعات ہوئے ہیں ان میں بہترین کتاب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی "ذکر آزاد" ہے، جب کہ مولانا کے افکار و خیالات پر سب سے جامع تصنیف آین ہنڈرسن ڈگلس کی "ابوالکلام آزاد این انٹلکچوال اینڈ ریلیجس بائیوگرافی" (انگریزی)۔ پہلی کتاب ۱۹۶۰ء اور دوسری ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئیں۔ دونوں کتابوں میں فرق یہ ہے کہ ملیح آبادی نے عقیدت کے باوجود اپنی حد تک حقیقت کی تصویر کشی

کی ہے، لیکن ڈگلس نے حقیقت پسندی کا انداز اختیار کر کے بھی متعدد امور میں محض افسانہ طرازی کی ہے، شاید اس لیے کہ اس کا مغربی و مسیحی ذہن اپنی مخصوص تربیت کے سبب مولانا آزاد کے ذہن و کردار کی متعدد خصوصیتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے، اس کے برخلاف ملیح آبادی کا مشرقی و اسلامی ذہن اپنے ممدوح کے مخصوص مزاج و طبیعت کو بخوبی سمجھ سکتا اور اس کی تشریح بھی ہمدردی کے ساتھ کر سکتا ہے۔" (ص۱۳، مولانا ابوالکلام آزاد — ذہن و کردار، از راقم السطور)۔ ڈگلس اور اس کے معاونین کی نافہمی کے سبب، جنہوں نے اس کی موت کے بعد کتاب شائع کی، بعض غلط فہمیاں ہو سکتی ہیں۔ ڈگلس کے انحرافات و تحریفات، غلطیوں اور مغالطوں کا ایک تنقیدی جائزہ راقم السطور نے اپنی محولہ بالا کتاب کے باب "ترجمان القرآن" میں (ص ۵۷ تا ۹۷) پیش کر کے دکھایا ہے کہ یہ انگریز عیسائی کس طرح حقائق کو مسخ کرتا ہے اور اس کے بیانات کس حد تک تضادات سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ مولانا آزاد نے وحی الٰہی کے متعلق ایک سوال کا جواب اپنے پرائیوٹ سکریٹری کو املا کرایا اور اس میں قرآن کو "کلام من عند اللہ" کہتے ہوئے "قول رسول" کا لفظ استعمال کیا ہے جو ظاہر ہے کہ وحی کے پیامبر حضرت جبرئیل کی طرف واضح اشارہ ہے، مگر ڈگلس نے عربی سے نابلد اور قرآن سے ناواقف ہونے کے باعث اس کی نسبت بالکل من مانے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر کے نعوذ باللہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مولانا آزاد کلام الٰہی کو کلام محمد سمجھتے تھے۔ اس ایک واقعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ڈگلس کی کتاب میں اعداد و شمار اور معلومات کی فراوانی کے باوجود مغالطے بہت زیادہ ہیں، اس نے محنت جتنی بھی کی ہو، اس کے اندر بصیرت کی سخت کمی ہے۔ لہٰذا ڈگلس کی کتاب کو زیادہ سے زیادہ مولانا آزاد پر تحقیقی کام کے لیے ایک خام مواد سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ اس کے نتائج بحث پر اعتبار کرنا گمراہی کو دعوت دینا ہوگا، مختصر یہ کہ یہ ایک غیر مستند اور نامعتبر کوشش ہے اور اس میں اسلام دشمن مستشرقوں کے سارے حربے مولانا آزاد پر آزمائے گئے ہیں۔

وقت آگیا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے دینی افکار، سیاسی خیالات اور عملی اقدامات کا مطالعہ حقیقت پسندی، جامعیت و صداقت اور اعتدال و توازن کے ساتھ کیا جائے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ بیسویں صدی کے اس عظیم عالم دین، ادیب اور سیاست داں نے

ملک و ملت اور انسانیت کے لیے کیا کارنامے انجام دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر کسی کو مولانا آزاد کے بعض تصورات سے اختلاف بھی ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ جس طرح اس شخص کو ایک رائے قائم کرنے کا حق ہے اسی طرح مولانا کو بھی ایک رائے رکھنے کا حق تھا اور انھوں نے جو کچھ اظہار خیال کیا یا سرگرمی دکھائی وہ پورے خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ۔ علم و فضل اور جہد و عمل میں مولانا آزاد کسی بڑے سے بڑے عالم یا مجاہد سے کم نہیں تھے بلکہ ان کا شمار دنیا کے معدودے چند عظیم ترین علماء و مجاہدین میں ہوتا ہے، ان کے ذہن و کردار کی عظمت و رفعت سے انکار صرف تعصب اور لاعلمی کا غماز ہوگا۔

ملی تحریک استقلال ہو یا قومی تحریک آزادی، اسلام کی ترجمانی ہو یا دنیا کی حکمرانی، ایک مفکر و مدبر کی حیثیت سے مولانا آزاد کا مرتبہ تاریخ عالم میں بہت بلند ہے۔ ان کے اعلیٰ افکار و اقدامات نے تاریخ بنائی ہے۔ ان کی شخصیت و سیرت عہد آفریں ہے اور بے شمار اہل فکر و نظر نے ان کے چراغ ہدایت سے چراغ جلائے ہیں، انہوں نے کئی نسلوں کے ذہنوں پر مثبت اثر ڈالا ہے اور ان کے کرداروں کی تربیت کی ہے، کم از کم آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تعمیر و ترقی میں مولانا آزاد کا حصہ بلا استثناء برصغیر کے کسی بھی رہنما سے کم نہیں۔ وہ قوم اور ملت بڑی احسان فراموش ہوگی جو مولانا آزاد کے کاموں کی قدر شناسی نہیں کر سکے۔

جہاں تک تقسیم ہند کے صحیح و غلط یا مفید و مضر ہونے کا تعلق ہے، تاریخ نے ابھی اس کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا ہے، ایک طرف پاکستان سے بنگلہ دیش کی علاحدگی اور سندھ میں مہاجر وغیر مہاجر کی آویزش ہے، تو دوسری جانب ہندوستان میں ہندو فسطائیت کا فروغ اور اس کے نتیجے میں پنجاب کے سکھوں اور کشمیر کے مسلمانوں کی شورش، پھر آسام کے آسامیوں اور تامل ناڈ کے تملوں کی بے چینی ہے، خود شمالی اور مغربی ہند میں فرقہ وارانہ فسادات کی کثرت و شدت ہے۔ لہٰذا ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ برصغیر میں ملتوں کے مسائل کا وہ حل زیادہ موثر ہوتا جو مولانا آزاد نے تجویز کیا تھا یا وہ جو مسٹر جناح نے پیش کیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ دونوں طرف کچھ نہ کچھ منطق اور معقولیت ہے اور نتائج و اثرات کے اعتبار سے بھی دلیلیں دونوں کے حق میں دی جا سکتی ہیں۔ ایسی حالت میں کسی ایک کو مسیحائی تصور کر کے دوسرے پر اعتراض دانائی کا ثبوت نہیں۔ رہ گیا اقامت دین کا معاملہ، تو مولانا آزاد اپنی زندگی کے آخری سانس تک، سخت ناساعد حالات کے باوجود، اپنے دینی

نصب العین پر کاربند رہے اور انھوں نے اپنے اسلامی نظریۂ حیات کو کبھی ترک نہیں کیا، سب سے بڑھ کر وہ ہمیشہ ایک نرے سیاست داں کے بجائے ایک عالم دین کی روش پر قائم رہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ایک غیر مسلم اکثریت کے ملک میں انہوں نے ایک سکولر ڈیموکریسی کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہتے ہوئے بھی ایک مسلمان بلکہ اسلامی قائد کی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ یہ صالح زندگی ایسی مثالی تھی کہ اس کے نمونۂ عمل سے عصر حاضر کے لادینی ماحول میں اسلامی تصور فلاح کی ایک مثال سامنے آئی اور اس کا مثبت اثر پورے ملک پر اس حد تک پڑا کہ آج تک قومی سیاست میں مولانا آزاد کے ذہن و کردار کی مثال دی جاتی ہے۔ متحدہ قومیت کا بھی جو موقف مولانا آزاد نے اختیار کیا وہ قوم پرستی اور وطن پرستی کے بجائے قوم پروری اور وطن دوستی کا تھا یعنی اسلامی خدا پرستی اور بین الملیت سے اس کا کوئی تصادم نہیں تھا، بلکہ یہ درحقیقت اس آفاقی وحدت انسانی اور عام اخوت و مساوات کا نظریہ تھا جو دنیا کو اسلام ہی کی دین ہے۔ اس نقطے پر آکر اقبال، آزاد اور مودودی مل جاتے ہیں خواہ ان کے انداز فکر میں مکمل مماثلت نہیں ہو اور ان کا انداز کار ایک دوسرے سے مختلف رہا ہو۔

مکتبہ تحقیق سے آپ یہ کتابیں طلب کرسکتے ہیں

۱۔ ام الکتاب۔ مولانا آزاد ۴۰/=
۲۔ ترجمان القرآن۔ " دوم ۷۵/=
۳۔ " " سوم ۷۵/=
۴۔ " " چہارم ۷۵/=
۵۔ تجلی۔ شاہ بلیغ الدین ۸۰/=
۶۔ آسمان ہدایت کے ستر ستارے۔ طالب ہاشمی ۷۰/=
۷۔ محسن انسانیت نعیم صدیقی ۷۰/=
۸۔ تعلیمات غزالی محمد حنیف ندوی ۶۰/=
۹۔ اقبال کا تصور دین۔ پروفیسر شفیق الرحمان ۷۵/=
۱۰۔ روح اسلام۔ سید امیر علی ۷۵/=
۱۱۔ فقہ الزکاۃ۔ یوسف القرضاوی ۴۵/=
۱۲۔ تفسیر نظام القرآن۔ مولانا فراہی ۱۰۰/=
۱۳۔ درس حدیث ۱۰۰/=
۱۴۔ عوارف المعارف شہاب الدین ۹۰/=

ملنے کا پتا: مکتبہ تحقیق۔ پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ